© rasailojaraid.com

ہفت روزہ "چٹان" /اداریہ

ایک ایسا محور، جس کے گرد افراد ہی نہیں محاسن بھی گھومتے تھے۔

تو نظیری زفلک آمدہ بودی چوں مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

جی چاہتا ہے آج جی بھر کر رولوں، بالآخر وہ بھی رخصت ہو گیا جو اس زمانے میں اللہ کی آیات میں سے ایک آیت تھا۔ جس نے مرتے دم تک فقر و استغناء کے پرچم کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ جس کی زندگی بہت سی زندگیوں کی مجموعہ تھی۔ جس کا وجود ایک تاریخ تھا۔ جو ایک عہد تھا ایک ادارہ تھا۔ ایک انجمن تھا ایک تحریک تھا۔ غرض ایک ایسا محور تھا جس کے گرد افراد ہی نہیں محاسن بھی گھومتے تھے۔ وہ اس پائے کا خطیب تھا کہ اس کی آتش بیانی کا لوہا اسکے حریف بھی مانتے تھے۔ اردو زبان نے اس مرتبہ کا خطیب نہ کبھی پیدا کیا اور نہ آئندہ کبھی کر سکے گی۔

وہ ایک مجاہد عظیم تھے۔ انہوں نے اعلائے کلمۃ الحق سے کبھی گریز نہیں کیا۔ ۷۲ برس کی عمر مستعار میں انہوں نے ۱۲ سال قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے میں بسر کئے اور ان کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہ آئی۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جنہیں شائد ان کے ارادوں کی بابت شک رہا ہو۔ مگر انہیں اپنے فیصلوں کے بارے میں کبھی شبہ نہیں ہوا۔ وہ اس مدرسہ فکر کے علمبردار تھے جن کی بنیادیں محمد قاسم نانوتوی اور محمود حسن کے مقدس ہاتھوں سے رکھی گئی تھیں۔ تمام زندگی ایک ہی مشن رہا کہ برصغیر سے انگریز کی حکومت کیونکر نکالی جا سکتی ہے۔ وہ علی الاعلان کہا کرتے تھے کہ میرے سامنے دو چیزیں ہیں اولاً انگریز کی حکومت یہاں سے ختم ہو جائے۔ ثانیاً وہ ختم نہیں ہوتی تو میں اس کے خلاف تبلیغ کرتے کرتے تختہ دار پر لٹک جاؤں۔

پھر ان کا دل عشق رسول ﷺ کی جلوہ گاہ تھا۔ حضور ﷺ کے عشق میں وہ اس قدر سرشار تھے کہ انہوں نے اپنے آپ کو اسی رنگ میں رنگ لیا تھا۔ ان کا اوڑھنا بچھونا ہی عشق تھا۔ اس عشق ہی نے انہیں ختم نبوت کے عقیدہ کی حفاظت کا مجاہد بنا دیا۔ پھر جس عشق و ایثار کے ساتھ انہوں نے اس راستے کا سفر کیا اس کی نظیر نہیں ملتی۔ وہ بہت سی غلطیوں کو معاف کرتے رہے مگر دو چیزوں سے نہ وہ کبھی سمجھوتے پر آمادہ ہوئے اور اس کے مقابلے میں وہ عفو و درگزر کو پسند کیا کرتے۔

اول..... انگریز کی غلامی اور اس کے گماشتوں کا دوستانہ۔

دوم..... ختم نبوت کے قزاقوں کا تعاقب۔

وہ کہا کرتے تھے میں توشہ آخرت کے طور پر یہی ساتھ لے جانا چاہتا ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ اپنے ساتھ وہ یہی لے گئے۔

وہ اپنے عہد کے ابوذر غفاری تھے۔ فقر و فاقہ ان کا شعار تھا۔ انہوں نے کبھی کسی تحریک و تنظیم کے قائد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وجماعت کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے۔ وہ خطابت وضمیر کی سودا بازی کے بازار سے ہی ناآشنا تھے۔ ان پر زمانے نے بہت سا گردوغبار پھینکا۔ اور خود فروشوں نے الزامات کے چولہے سے چنگاریاں لے کر بارہا ان کی دستار فضیلت پر پھینکیں۔ مگر وہ تہمتوں کے بازار سے کنکریاں کھاتے ہوئے نکل گئے۔ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بارگاہ میں سرخرو ہوگئے ہیں۔ انشاء اللہ قیامت کے روز بھی سرخرو ہی اٹھیں گے۔

تذکروں میں ہے کہ جب امام ابن تیمیہ کا جنازہ اٹھا تھا تو پورا شہر اشکبار ہو کر نکل آیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی مظلومیت نے لوگوں کے دلوں کو احاطہ کر لیا ہے اور بے چین عوام وقت کی اس عظیم الشان دولت کو آخری خراج ادا کرنے کے لئے جمع ہوگئے ہیں۔

شاہ جی کا جنازہ بھی اسی دھوم دھام سے اٹھا۔ ایک انسان جو عمر بھر مہاجر رہا اور جب امرتسر سے مہاجرت کر کے ملتان میں پناہگزین ہوا تو ایک کچا مکان کرائے پر لے کر بارہ برس اس میں رہا۔ آخر وہیں اس کی روح نے قفس عنصری سے پرواز کیا۔ وہیں سے اس کا جنازہ اٹھا۔ لیکن فقیر کا جنازہ شاہوں کے جنازے کو مات دے گیا۔ ایک شخص جو بالطبع فقیر تھا۔ جس کے دامن میں اللہ کے خوف اور رسول ﷺ کے عشق کے سوا کچھ نہ تھا۔ جس کو ہمیشہ زنجیروں نے سلام کیا۔ جس کا سیم وزر کے بت خانوں میں ذکر تک مفقود رہا۔ جس نے ایک لحظہ کے لئے بھی اخباروں اور کتابوں کے صفحوں میں اپنا نام ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی۔ جو آخر تک چارپائی پر بیٹھتا، لیٹتا اور سوتا رہا۔ جو اس مقام میں بھی رسول ﷺ کی زندگی کی عکس تھا اور جب اس نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا تو ایک اور ڈیڑھ لاکھ کے درمیان لوگ اشکبار چہروں کے ساتھ اس کی میت کے گرد جمع ہوگئے۔ ان میں ایک تہائی لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ لوگوں نے سینے پیٹ لئے۔ کیا اس فقیر نے یہ آنسو خریدے تھے؟ وہ تو شاید دوسرے وقت کی روٹی خریدنے پر بھی قادر نہ تھا۔

یہ سب کچھ اس کی بے غرضی اور بے نفسی کا صلہ تھا۔ وہ اگر لاہور، لائلپور، گوجرانوالہ، سیالکوٹ میں رحلت فرماتے تو ہجوم کئی لاکھ تک پہنچ جاتا۔ لیکن دور افتادہ اور پسماندہ ملتان میں بھی ان کا ماتم اس شدت سے کیا گیا کہ ملتان کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں۔ ہم نے اپنے اس وطن عزیز میں بہت سے جنازے دیکھے ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے علماء اور فضلا آغوش لحد میں اتارے گئے۔ لیکن شاہ جی کی میت کے گرد عشاق کا جو ہجوم تھا اور لوگوں نے جس بے اختیاری کے ساتھ ان کا ماتم کیا۔ فقرا و علماء کی پوری صف اس سے خالی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شاہ صاحب دماغوں اور دلوں کے حکمران تھے۔ اپنی بے سروسامانی کے باوصف انہیں اس اقلیم میں جو وقار اور اقتدار حاصل تھا۔ اس کا اقرار و اعتراف ہر جگہ موجود ہے۔ پاکستان میں وہ ایک ہی شخص تھے جو سیاسی اقتدار، جماعتی رفاقت اور تنظیمی خطوط کے بغیر اپنی ذات میں ایسا جادو رکھتے تھے کہ لوگ سر دینے کے لئے تیار ہو جاتے۔ ان کے فدائیوں کا قبیلہ ملک کے ہر گوشہ میں موجود ہے۔ ان کے اٹھ جانے سے جو خلاء پیدا ہو گیا وہ کبھی پر نہ ہوگا۔ خطابت بیوہ ہو گئی۔ لوگ کبھی اس طرف سے گزریں گے جہاں شاہ جی

© rasailojaraid.com